دامِ خیال

ضیاء الاسلام

سلسلہ حلقۂ ادب نمبر ۲

پہلا اڈیشن	اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء	ایک ہزار
دوسرا اڈیشن	جون سنہ ۱۹۴۶ء	ایک ہزار

اُردو پبلشنگ ہاؤس

الہ آباد

قیمت عہ/

اُسکے نام

جس کو معلوم بھی نہیں کہ یہ اُس کے نام ہے

تو خورشیدی و من سیّارۂ تو
سراپا نورم از نظّارۂ تو۔

ترتیب

ترتیب

اُفتادگی

زخم کا اندمال کون کرے — جرأتِ عرضِ حال کون کرے
زندگی کو وبال کون کرے — آرزوئے کمال کون کرے
رُخِ ساقی کی ضوفشانی سے — اکتسابِ جمال کون کرے
رکھ تو دی ہے متاعِ دل لاکر — دیکھئے پائمال کون کرے
سوز کی آرزو اگر نہ رکھے — التجائے وصال کون کرے
دردِ دل کی جو داد دے نہ سکے — اس سے پھر قیل و قال کون کرے
چشمِ ساقی ہے مے فروش مگر — منفعل ہیں سوال کون کرے

دل کی بیتابیاں ارے توبہ
شرحِ حزن و ملال کون کرے

یہ کیا کیا؟

رنگینئ شباب دکھا کر چلے گئے
ہم کو مگر شراب پلا کر چلے گئے
سینہ کو ماہتاب بنا کر چلے گئے
ذرّہ کو آفتاب بنا کر چلے گئے
مدہوش و مست خواب بنا کر چلے گئے
رنگیں سا ایک خواب دکھا کر چلے گئے
آئے تھے یوں کہ میری محبت کو دیکھ لیں
دل کو مگر حباب بنا کر چلے گئے

وہ مسکرائے ناز سے اس طرح آج پھر
بھولا سا ایک خواب دکھا کر چلے گئے

اشعار

نہ جانے عرصۂ محشر میں کیا ہو شانِ ہنگامہ
غمِ فردا کو چھوڑیں آج بزم آرائیاں کر لیں
سنا بیمارِ غم کا ان دنوں کچھ حال اچھا ہے
عیادت کو وہ آئیں گر تو حسن افزائیاں کر لیں
خدا ہی جانے برقِ طور اب ہے منتظر کس کی
دیارِ حسن میں لو ہم بھی جبہ سائیاں کر لیں

جورِ باغباں

ہمنشیں سمجھا کہ میں مخمور ہوں بے ہوش ہوں　　زندگی کی کشمکش میں میں سراپا ہوش ہوں
تو سراپا نغمہ بن جائیں ہمہ تن گوش ہوں

رازِ ہستی راز ہے، رازِ فنا بھی راز ہے　　میں ہوں صحرا کا کنارہ موج کی آغوش ہوں
تو سراپا نغمہ بن جائیں ہمہ تن گوش ہوں

کس طرح برداشت کرتا ہوں میں جورِ باغباں　　دیکھتا ہوں رنگ گلشن اور پھر خاموش ہوں
تو سراپا نغمہ بن جائیں ہمہ تن گوش ہوں

توڑتا ہوں بندِ غم اور کھینچتا ہوں سینہ آہ　　محفلِ ساقی میں میں مصروفِ نائے و نوش ہوں
تو سراپا نغمہ بن جائیں ہمہ تن گوش ہوں

بادۂ مغرب نے کھوئے ہیں مرے ہوش و حواس　　میں وفورِ درد میں محرومِ عقل و ہوش ہوں
تو سراپا نغمہ بن جائیں ہمہ تن گوش ہوں

اِلتجا

صبح کی ہلکی سپیدی میں ہے گل بلبل نواز
کر رہا ہے بے نیازِ دوجہاں سازِ حجاز
بندہ پرور آج تو بنجائیے عاشق نواز

کیا فضا ہے کیا گھٹا ہے اور کیا ہلکی پھوار
اب سکوں نہیں اب تلاطم میں ہے جانِ شعلہ باز
بندہ پرور آج تو بنجائیے عاشق نواز

چپ ہیں کچھ کہتے نہیں اور محوِ حسنِ دوست ہیں
دیکھو اُو کافر ادا کرتے ہیں یوں عاشق نماز
بندہ پرور آج تو بنجائیے عاشق نواز

کب چھپائے سے بھلا چھپتا ہے اب اُلفت کا راز
قمری نالاں نے چھیڑا ہے دوامی غم کا ساز
بندہ پرور آج تو بنجائیے عاشق نواز

سوزِ عشق و دردِ ہجراں کر رہے ہیں سینہ چاک
آپ سے پوشیدہ کب ہے اب ہمارا سوز و ساز
بندہ پرور آج تو بنجائیے عاشق نواز

صدائے چنگ

ایں صحبتِ جانانہ، ایں محفلِ رندانہ
ایں گردشِ پیمانہ، ایں لغزشِ مستانہ
ایں ہم ہمہ ہنگامہ، آں ہم ہمہ ہنگامہ

آں دورِ مئے کہنہ، آں صحبتِ میخانہ
در محفلِ جانانہ، ہائے وہوئے رندانہ
آں ہم ہمہ افسانہ، ایں ہم ہمہ افسانہ

اشعار

رنگین ہے بہار لیکن افسوس
بے صحبتِ یار کچھ نہیں ہے
اے ساقی ناہوش کرم کر
بے بادہ بہار کچھ نہیں ہے

غزل

کہاں کا قصۂ صبر و قرار رہنے دے
فضائے غم میں مجھے اشکبار رہنے دے

نمودِ حسن ہے بزمِ طرب غزلخوانی
مجھے خرابِ مئے دلفگار رہنے دے

یہ سوزِ دل کی جنوں خیزیاں معاذ اللہ
کرم بھی کر نگہِ شرمسار رہنے دے

فغانِ درد بھی ہے اور پیامِ راز بھی ہے
نگاہِ مست اگر ہوشیار رہنے دے

ہجومِ یاس میں کیسا پیامِ ہوش و سکوں
ہجومِ یاس میں کیسا قرار رہنے دے

یہ داغہائے جگر اے خدا کبھی نہ مٹیں
یہ داغہائے جگر برقرار رہنے دے

یہ چاکہائے جگر پھر ذرا رفو کر لوں
ذرا ٹھہر نگہِ فتنہ کار رہنے دے

کہاں کا بادۂ عشرت کہاں کا لطفِ خمار
مجھے قتیلِ غمِ روزگار رہنے دے

انکی بے التفاتیاں نہ گھٹیں
اپنی اُمیدواریاں نہ گئیں
نہ ہوا آرزو سے سینہ پاک
عشق کی خامکاریاں نہ گئیں

حسن کی شعلہ بازیاں نہ گئیں
عشق کی دلگدازیاں نہ گئیں
گرچہ رسوا ہوے زمانہ میں
دل کی رنگیں مزاجیاں نہ گئیں

کچھ نہ پوچھئے

اندازِ دلربائیِ جاناں کے سحر سے
دل کا ہے آج رنگ دگر کچھ نہ پوچھئے

درویش کو سیاستِ دُنیا سے کیا غرض
ہم سے کسی کے عیب و ہنر کچھ نہ پوچھئے

ہم نے کشاکشِ غمِ پنہاں کے فیض سے
کیسا پیا ہے خونِ جگر کچھ نہ پوچھئے

سینہ کو ایک تختۂ پرگل بنا دیا
ساقی کی اک نگہ کا اثر کچھ نہ پوچھئے

شعروں میں جو ضیا کے ہیں رنگیں بیانیاں
شب کے خمار کا ہے اثر کچھ نہ پوچھئے

غزل

صدائے بازگشت آتی ہے ابتک کوہ فاراں سے
خدا محفوظ رکھے شعلہ ہائے حسن عریاں سے
خدا رکھے حریم دل میں اک ہنگامہ برپا ہے
تغافل ہائے ظاہر سے نوازشہائے پنہاں سے
مبارک ہو دل بشکستہ میں سامان محشر ہے
ہجوم شوق سے ہنگامۂ فصل بہاراں سے
یہ سنکر حشر میں شان کرم بیتاب نکلے گی
صبوحی سے جھلک اٹھی تلاطمہائے عصیاں سے

خیالِ تنگیٔ داماں پہ سیلِ اشک جاری ہے
رواں ہے ایک جوئے خون ہر تارِ گریباں سے
مٹایا دشت ایمن کو جلایا طورِ سینا کو
نگاہِ حسن کی گرمی نہیں کم برقِ خنداں سے
کہاں ہم اور کہاں تکمیل ذوقِ آستاں بوسی
پریشاں دل اُلجھ بیٹھا تھا اک خوابِ پریشاں سے

عشق کی نغمہ زائیاں توبہ

حسن کی رونمائیاں توبہ
اُس پہ سادہ ادائیاں توبہ

اُنکا آنا نظر مہینوں بعد
ہائے وہ خوش ادائیاں توبہ

وہ ہمارا اسلام کر لینا
اُن کے منہ پہ ہوائیاں توبہ

شوق کی بیخودی کا وہ عالم
عشق کی نغمہ زائیاں توبہ

دل میں ہنگامہ لب پہ مہر سکوت
عاشقی کی دہائیاں توبہ

عشق کا ساز حسن کی مضراب
دیر تک خوش نوائیاں توبہ

بعدہٗ اُن سے نامہ و پیغام
ان کی بے اعتنائیاں توبہ

صدائے جنوں

رسم و رہِ دُنیا سے بیگانہ بنانا تھا
ایوانِ محبت کا پروانہ بنانا تھا

اللہ سے شکوہ ہے خاکم بدہن مجھکو
فرزانہ بنایا کیوں دیوانہ بنانا تھا

ہوش و خرد و دانش سب غرقِ شراب
آئینِ محبت کو رندانہ بنانا تھا

اے عشق جنوں پیشہ یہ آبلہ پائی کیوں
سنگِ درِ جاناں پر کاشانہ بنانا تھا

وہ نورِ سحر چمکا وہ موجِ شراب اُٹھی
عاشق کو تجھے آخر دیوانہ بنانا تھا

سرود

ایں درد کہ من دارم شد آتشِ جان و دل
ایں درد کہ من دارم زنہار نہ بایستے
بتخانہ شکستم من، توحید پرستم من
بر دوشِ نگارِ من زنار نہ بایستے
اے حسرتِ پابوسی صد وائے بہ حالِ تو
آں طالعِ بیدارم، بیدار نہ بایستے

نذرِ محبت

محبت میں ہم نے جوانی لٹادی — جوانی ہی کیا زندگانی لٹادی
ترے عشق میں زندگانی لٹادی — تری یاد میں نوجوانی لٹادی
ترے درد والوں کے دل کیا بتائیں — ترے غم میں کیوں شادمانی لٹادی
تری مست نظروں کے فیضِ رواں کو — جو دیکھا مئے ارغوانی لٹادی
مگر تیرا کوچہ ہے فردوس منظر — تری راہ میں نوجوانی لٹادی
وہ صبح سویرے ترا مسکرانا — یہ کس نے مئے ارغوانی لٹادی
وہ شام محبت وہ رنگین منظر — کہ قدموں میں تیرے جوانی لٹادی
جوانی تھی اک خواب رنگین و دلکش — نہ معلوم پھر کیوں جوانی لٹادی

دُنیا کی محبت کو ٹھکرا کے ایسے
نہ معلوم یوں کیوں جوانی لٹادی

اشعار

دل خطاوار تھا مجرم بھی تھا سودائی بھی
حسن کی سادہ ادا اُس کو پسند آئی بھی

اُن کی رنگین نگاہی کے تصدق جس سے
آگئی عشق میں اک شان خود آرائی بھی

نغمۂ پریشاں

عشق حیراں و پریشاں ہی رہا
حسن خنداں و گل افشاں ہی رہا

دل پہ جو گذری وہ گذری پھر بھی دل
یاد میں اُن کی غزل خواں ہی رہا

آکے بھی بیٹھے بھی وہ تسکین بھی دی
دل مگر رہینِ حرماں ہی رہا

دل کو کیا کہیے کہ وہ دیوانہ ہے
اسکے پہلو میں خمستاں ہی رہا

حسن کی نظریں اُٹھیں اُسکی طرف
دل مگر بریاں و گریاں ہی رہا
حسُن میں کافر نگاہی تھی مگر
دل محبت میں مسلماں ہی رہا
ہائے ضیاؔ دیوانہ دیکھا صبح تک
وہ شریک بزم رنداں ہی رہا
صبح کو دیکھا تو نورِ صبح میں
نغمہ پیرا اور غزل خواں ہی رہا

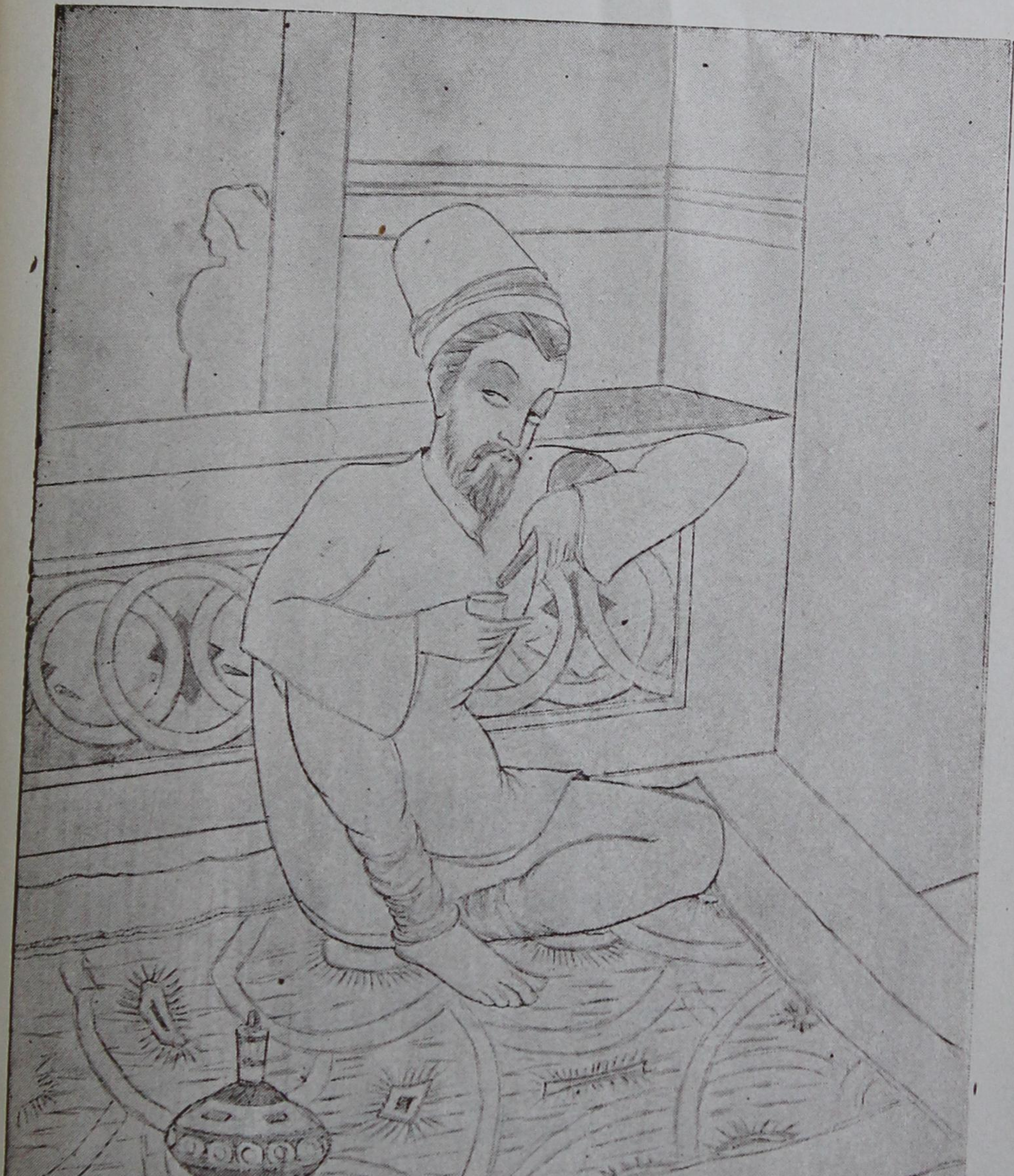
اشعار

ہمارا قصۂ غم خونچکاں ہے
کسی رنگیں قبا نے مار ڈالا

متاعِ ہوش پہ بجلی گرادی
تری قاتل ادا نے مار ڈالا

گھٹا مغرب سے اُٹھی کالی کالی
ہمیں ایسی فضا نے مار ڈالا

ہمارے دل میں رہکر ہم سے پردہ
اس اندازِ حیا نے مار ڈالا



کیوں انتظارِ ساقیٔ بیگانہ کھینچیے
بس خم پہ خم لنڈھائیے پیمانہ کھینچیے

طیورِ آوارہ

دل کی آشفتہ حالیاں نہ گئیں   اُن کی رعنائیاں قیامت تھیں

غم میں ترے بہارِ زیست نذر کی اور صلہ نہیں
عشق بہانہ ساز کو پھر بھی مگر گلہ نہیں

بہار آئی ہے واں صحنِ چمن میں ہم یہاں گل کو ترستے ہیں
پریشاں حالیوں کو دیکھکر عشاق کی آنسو برستے ہیں

دیکھیں تو نظر والے گل کاریِ داماں سے   خونِ دلِ عاشق میں کیا جوہر نگیں تھے

عشاق کی ہوشیندی ہے   ہنگامۂ زیست دیدنی ہے

جوشش گریہ سوزِ الم دونوں نے مارا اے ہمدم
اک آگ سی دل میں جلتی ہے، دھیمی دھیمی جلتی ہے

تمھیں شراب بنی جا رہی ہو میرے لیے   ابھی شراب کے آنے میں دیر ہے لیکن

آتشکدۂ تمنّا

وہ پیمانِ اُلفت سے سرشار آنکھیں
شرر بار آنکھیں گہر بار آنکھیں
وہ مستی میں بھی اُن کی ہشیار آنکھیں
یہ سنتے تھے ہیں اُن کی بیمار آنکھیں

بہارِ مجسّم، بہارِ جوانی
فروغِ بہاراں سے گل بار آنکھیں
مری زندگانی تصدّق ہے اُن پر
نہ بھولیں گی مجھ کو وہ غمخوار آنکھیں
تمنّا کا آتشکدہ جل اُٹھا پھر
جو یاد آئیں اُن کی طرحدار آنکھیں

———•—•••—•———

خلوتِ زنداں

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل
یعنی چراغ خلوتِ زنداں ہے آجکل
پھر ہوش و عقل شعلہ بداماں ہے آجکل
اک سحر ہے کہ یار غزلخواں ہے آجکل
اپنی جفاؤں پر وہ پشیماں ہے آجکل
تجدیدِ اشتیاق کا ساماں ہے آجکل
ساقی نے پھر بلائے ہیں احباب بادہ نوش
یعنی شکستِ توبہ کا ساماں ہے آجکل

آزاد ہیں زمان و مکاں کے قیود سے
ہر لحظہ سجدۂ درِ جاناں ہے آجکل
ساقی کے التفات سے مستی فضا میں ہے
ہر اک گدائے میکدہ سلطاں ہے آجکل
اس شاہدِ لطیف کی رنگینی خرام
قدموں میں اسکے ایک گلستاں ہے آجکل
اللہ رے اس مغنی آتش نفس کی لے
توبہ کہ اس سے روح بھی رقصاں ہے آجکل
کیا پوچھتے ہو رنگِ ضیا رہن میکدہ
سجادہ و قبائے زرافشاں ہے آجکل

اشعار

آرزو یہ ہے کہ آؤ بے اثر ہو جاؤں میں
تیرے نظارہ میں سرتاپا نظر ہو جاؤں میں

کسی کی یاد تسکینِ دل و جاں بنتی جاتی ہے
کسی کا درد پیوستِ رگ جاں ہوتا جاتا ہے

چاند کے سایہ میں

حکایتِ غمِ پردیں سنا رہا ہے چاند
پڑا جگر میں مرے مُسکرا رہا ہے چاند
کسی کا جلوۂ زیبا دکھا رہا ہے چاند
وفورِ شوق میں خود مُسکرا رہا ہے چاند
قبائے دلکش و زرّیں سمیٹ کر اپنی
بگڑ گئے ہیں تو اُن کو منا رہا ہے چاند
حسین خوابوں کی دُنیا ہوئی ہے آوارہ
نہ جانے کونسا عالم دکھا رہا ہے چاند

ربابِ رنگیں

اُف وہ رنگیں شباب آنکھوں میں
اِک بہکتا سا خواب آنکھوں میں

مے کشوں میں یہ دھوم ہے کہ پئیں
وہ گلابی شراب آنکھوں میں

زاہدوں کو بھی شوق اُٹھا کہ پئیں
جب سے دیکھی شراب آنکھوں میں

دل میں ہنگامہ کر گیا برپا
وہ مچلتا شباب آنکھوں میں

تار سب دل کے جھنجھنا اُٹھے
اُف وہ رنگیں رباب آنکھوں میں

جب سے میخانہ چھٹ گیا افسوس
خوں ہے دل میں نہ آب آنکھوں میں

اس پہ سو شوخیاں نثار ضیاؔ
وہ جو ہے اِک حجاب آنکھوں میں

دھوم مچائیں رنگ جمائیں

آجاؤ مِل مِل کر گائیں
گائیں اور اک دھوم مچائیں
دھوم مچائیں رنگ جمائیں
آجاؤ مِل مِل کر گائیں
مار ورے مورے تیر

کیسے کاٹوں ایسی راتیں
گھنگھور گھٹا برساتیں
کر لو پیتم پریت کی باتیں
آجاؤ مِل مِل کر گائیں
مار ورے مورے تیر

جب سے تم نے منہ کو موڑا
غیر سے اپنا رشتہ جوڑا
میرا دل ہے ٹھوڑا ٹھوڑا | آجاؤ بل بل کر گائیں
مارو رے مورے تیر

کیسے آؤں تمہارے پاس
کیسے باندھوں جھوٹی آس
پریت نہ آئی مجھ کو راس | آجاؤ بل بل کر گائیں
مارو رے مورے تیر

جھوٹی باتیں جھوٹی پریت
جھوٹی باتیں جگ کی ریت
کون کسی کا ہوگا میت! | آجاؤ بل بل کر گائیں
مارو رے مورے تیر

وہ آئی اور بزمِ دل کو گرماتی ہوئی آئی

ٹھہر اے دل کہ زہرہ نور برساتی ہوئی آئی
شراب و شعر کی دُنیا کو شرماتی ہوئی آئی
وہ آئی رنگ و بو کی ایک دنیائے حسین بنکر
وہ چشمِ مست کا اعجاز دکھلاتی ہوئی آئی
وہ اندازِ حسیں اس کا وہ روئے آتشیں اس کا
وہ آئی اور رنگ خلد برساتی ہوئی آئی
وہ چھائی اک بہارِ تازہ بن کر میری ہستی پر
شباب و حُسن کے انداز دکھلاتی ہوئی آئی
نگاہِ شوق اسکی منتظر تھی ایک مدّت سے
وہ آئی اور بزمِ دل کو گرماتی ہوئی آئی

تمھیں بتاؤ کہ ہم لوگ کیا کریں سلمیٰ

گناہگار تمھارے بہار کو ترسیں
تمھارے لطف کے دیوانہ پیار کو ترسیں
فضائے باغ و لبِ جوئبار کو ترسیں
ہجوم ابر کے رنگین حصار کو ترسیں
تمھیں بتاؤ کہ ہم لوگ کیا کریں سلمیٰ!

تجھ سے رنگیں حیات ہوتی ہے

پھر نگاہوں میں بات ہوتی ہے
پھر سے رنگیں حیات ہوتی ہے

تو نے اک آرزو جو بخشی تھی
گاہ ہنستی ہے گاہ روتی ہے

ق

گاہ موتی سے کچھ پروتی ہے
داغ بس دل کے یونہی دھوتی ہے

آرزوئے رخ و لبِ میگوں
آج تک دل میں یونہی ہوتی ہے

تیری سادہ نگاہ دل میں مرے
درد اور لطف کو سموتی ہے

ترک الفت نہ ہو سکا ہم سے
اک کسک بے جواب بھی ہوتی ہے

تو ہے اک پیکرِ نشاط و حیات
تجھ سے رنگیں حیات ہوتی ہے

عظمتِ کج کلاہی میری
میری دنیا میں اب بھی ہوتی ہے!

آنکھوں کے ساغر ہلکے گلابی   پھر اُنسا ساقی مجھ سا شرابی
کیفِ محبت رقصاں نظر میں   وہ بھی شرابی میں بھی شرابی


C. Sartorio

فیضِ عشق

سوزِ دل را فاش گفتن ابتذالِ عاشقی
در حریمِ حسنِ تو من عاشق و پروانہ
ہم نشیں آتش فروزیہائے عشقِ بیکراں
اشکِ خوں آلودہ و سینہ مثالِ شانہ

کشمکش

اُس عہدِ کہن کی پاسداری کب تک؟
سیلابِ جنوں میں ہوشیاری کب تک؟
دِل خون ہوا آنکھوں سے آنسو جاری؟
اُف سوزِ جنوں کی رازداری کب تک؟

ہم اور آپ

زندگی اک بلائے بیرم ہے
موت آتی نہیں تو جیتے ہیں
ہم لہو پی کے زندہ ہیں اور آپ
یہ سنا ہے شراب پیتے ہیں

محبّت

تیری الفت شراب بنکے رہی
ایک رنگیں سا خواب بنکے رہی
اوّل اوّل تو کچھ خلش سی ہوئی
بعدہٗ ماہتاب بنکے رہی

اعجازِ نگاہ

زندگی اک گناہ ہے ہمدم
اِک بھٹکتی سی آہ ہے ہمدم
جس سے ذرّاتِ دل چمک اٹھیں
ایک سادہ نگاہ ہے ہمدم

شہادت

جنھیں تلاش تھی اک زندگیِ پیہم کی
وہ دشتِ شوق میں خود غرق خوں ہوئے ہیں آج
بہار ہے یہ مزا ہے کہ خونِ گلچیں سے
گلِ سمن بھی گلِ لالہ گوں ہوئے ہیں آج

نویدِ شادمانی

آنے کو ہے دورِ شادمانی ہمدم
رنگیں ہے مزاجِ زندگانی ہمدم
اغیار کے آتش زدہ خرمن سے مجھے
آتی ہے صدائے کامرانی ہمدم

شعلۂ بینا

اُٹھتی نہ تھیں غیرت سے نگاہیں اے دل
مسدود تھیں زندگی کی راہیں اے دل
ہو مژدہ کہ ہنگام سحر آ پہونچا
شعلوں کو عطا ہوں گی نگاہیں اے دل

بے بسی

مانگے ہوئے لفظوں میں روانی کیسی؟ مسکین دلوں میں شادمانی کیسی؟
یاں شدتِ غم سے سانس لینا ہے محال یخ بستہ فضاؤں میں جوانی کیسی؟

بیخودی

آج کی شام سازِ غم مت چھیڑ　　آج مجھ کو شراب پینے دے
فکرِ فردا نے دل کو سرد کیا　　فکرِ فردا کو نیند لینے دے

سجدۂ آستانۂ اغیار

زندگی پر فضائے تیرہ و تار
یاں ہمیشہ رہی ہے گوہر بار
اور دلوں کو یہ حکم ہے کہ کریں
سجدۂ آستانۂ اغیار

قطعہ

بسی ہے آج تک دل میں تری یاد   کبھی اے جانِ شیریں پھر نظر آ
مری دُنیا ہے پھر بھی تجھ سے آباد   یہ مانا تو ہے ملکیت کسی کی

رنگین تھی سب دُنیا رنگین تھیں سب راتیں

تم بھول گئیں باتیں
وہ کیف بھری راتیں
چھپ چھپ کے ملاقاتیں
رنگین تھی سب دنیا، رنگین تھیں سب راتیں

تھیں عشق کا حاصل تم
اُمید کا ساحل تم
اور لطف پہ مائل تم
رنگین تھی سب دُنیا، رنگین تھیں سب راتیں

ساقی مرے اے ساقی
اک داغ سا ہے باقی
رخصت ہوئیں وہ راتیں
رنگین تھی جب دنیا، رنگین تھیں جب راتیں

غزل

یا دکھا کر اپنا جلوہ مجھ کو بے خود کیجیے
یا مجھے لطفِ جنوں سے آشنا کر دیجیے

یا سنا دیجے مجھے پیغامِ دلداریٔ عشق
یا جنونِ فتنہ ساماں کو فنا کر دیجیے

یا سرِ نو محفلِ عالم کی تزئیں کیجیے
یا فراموش اب رہِ صدق و صفا کر دیجیے

یا مٹا دیجے زمانہ سے شبابِ شعلہ زا
یا یہ حسن و عشق کی دنیا فنا کر دیجیے

یا اٹھا دیجے یہ رسمِ پیرویٔ کوہکن
یا ضیاؔ کے واسطے آغوش وا کر دیجیے

نغمۂ کہسار

مری حیات کو اک سوزِ مستقل کر کے
دیارِ شوق میں اِک شمع مشتعل کر کے
خدا ہی جانے کہاں وہ چلی گئی ہے ندیم؟

شبِ بہار کا دُھندلا سا خواب باقی ہے
مرے پیالہ میں اب تک شراب باقی ہے
شراب جس کو وہ چھلکا گئی تھی میرے ندیم

یہ کہہ رہی تھی وہ ہے مرغزار کی دُنیا
مرے وطن میں ہے اک آبشار کی دُنیا
وہ آبشار یہاں بھی رواں تھے ہیں ندیم

مرے رباب میں اک تار بھی نہیں، نہ سہی
طویل شام کا رنگیں خمار بھی نہ سہی
وہ میری روح کو نغمے سنا رہی ہے ندیم

وہ دل نواز نگاہیں وہ مخملیں باہیں
وہ حسن و شوق کی رنگیں و مختلط راہیں
وہ میری روح میں دل میں سما رہی ہے ندیم

یہ آرزو ہے کہ اب غم حرام ہو جائے
کبھی قبول ہمارا اسلام ہو جائے
خدا ہی جانے کہاں وہ چلی گئی ہے ندیم ؟

خدا ہی جانے وہ کب مڑ کے آئیگی اے دوست
وہ کب حیات کو جنت بنائیگی اے دوست
دہکتے ہونٹوں سے وعدہ تو کر گئی ہے ندیم

سرود

آنکھوں پہ تری شیشہ و پیمانہ لٹا دوں
جنبش جو نظر کو ہو تو میخانہ لٹا دوں

اس نورِ مجسم پہ پری خانہ لٹا دوں
پھر کعبہ تو کعبہ ہے صنم خانہ لٹا دوں

قدموں پہ ترے دولتِ شاہانہ لٹا دوں
یعنی ہیں غرورِ دلِ دیوانہ لٹا دوں

زندگی اور موت

زندگی اسکے لئے شاہدِ رعنا و شراب
اور میرے لئے بس گریۂ شام و سحری
زندگی اسکے لئے عشرتِ شبہائے طویل
اور میرے لئے بس عشق کی آشفتہ سری
موت اس کے لئے اندیشۂ صد کام نہنگ
اور میرے لئے آسودگیٔ رنج و محن

ربابِ رنگیں

پھر چھیڑ دے مغنی اپنا ربابِ رنگیں
اور اس میں جذب کر دے اپنا شبابِ رنگیں

دنیا کی نعمتوں سے مجھ کو عزیز تر ہیں
تیرا ربابِ رنگیں، میری شرابِ رنگیں

رنگین تھا وہ خود بھی اور تو نے نور بھر کر
دل کو بنا دیا ہے اِک ماہتابِ رنگیں

اُن کا وہ روئے روشن، اپنا یہ داغِ اُلفت
اک آفتابِ رنگیں، اک ماہتابِ رنگیں

اے روحِ جانِ اُلفت کب دل کو بھولتا ہے
تیرا حجابِ رنگیں، تیرا عتابِ رنگیں
رنگین یوں تو تھے ہی سب بابِ عاشقی کے
رنگین سب سے پایا تیرا حجابِ رنگیں
سارے حسین نغمے پیوست تھے جو دل میں
تیری نظر سے نکلے بن کر ربابِ رنگیں

مخمور راتیں

نگاہوں میں گھر کر وہ شرما رہی ہیں
پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی ہیں

فسانہ وہ میرا سُنے جا رہی ہیں
نگاہیں اک افسانہ خود گا رہی ہیں

کلی دل کی شاید کھلی جا رہی ہے
اداؤں سے خود اپنی شرما رہی ہیں

مرے شوق بسیار کی کامرانی!
چلی آ رہی ہیں، کھنچی آ رہی ہیں

وہ رنگیں باتیں وہ مخمور راتیں
مجھے آج رہ رہ کے یاد آ رہی ہیں

کب آؤگی تم

کب تک یوں ترساؤ گی تم
کب تک دل برماؤ گی تم
جلوہ کب دکھلاؤ گی تم
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

پیاری پیاری باتیں ہے ہے
رنگیں رنگیں گھاتیں ہے ہے
اُف وہ مہکتی راتیں ہے ہے
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کالی کالی گھٹائیں آئیں
دل پر غم بن بن کر چھائیں

ذوقِ نغمہ و مستی لائیں
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کھوئی، ہوئی سی باتیں میری
سونی سونی راتیں میری
دل سے ہر دم باتیں میری
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

آہ وہ کافر مست نگاہیں،
آہ وہ گوری گوری باہیں
آہ وہ میرے دل میں راہیں
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

موجیں بھرنا وہ ساری کا
طوفاں سا اک گل کاری کا
فرمان حسیں مے خواری کا
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟


Zohra

آؤ آؤ جلدی آؤ
آکر اپنا روپ دکھاؤ
روپ دکھاؤ دل لے جاؤ
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

تم کو میں دل میں بٹھلاؤں
تم کو سُندر گیت سناؤں
خود روؤں تم کو بھی رُلاؤں
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

یاد تمھاری آفتِ جاں ہے
نام تمھارا لب پہ رواں ہے
یہ ہی وظیفہ وردِ زباں ہے
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

تیرے لئے لیا ہے جوگ

میرے دل میں سمایا سوگ
سوگ بھی کیسا سوگ
تیرے لئے لیا ہے جوگ کیسا لگا یہ من کو روگ

عاشق سے منہ موڑنے والی
دل کی دنیا توڑنے والی
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ

تو نے جتنی ہم پہ جفا کی
اُتنی ہے اُمید وفا کی
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ

آنکھوں میں وہ پریت کا پانی
وہ تیری رنگین جوانی
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ

آنکھوں سے آنکھوں میں وہ اشارے
ہاتھ ترے وہ پیارے پیارے
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ
وعدہ اپنا بھول نہ جانا
میری مرادیں بھول نہ جانا
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ
ابکی ہی برسات میں آنا
تاروں والی رات میں آنا
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ
آجا سلمیٰ ساز اُٹھا لے
بس اب تو مضراب اُٹھا لے
تیرے لئے لیا ہے جوگ، کیسا لگا یہ من کو روگ

عمر خیام کی ایک صحبت

شاعر
خود گنگناتا ہے

عید کیا میرے لئے پیغام عشرت لائیگی؟
اُنکی زلفِ پُر شکن سے یا تو وحشت لائیگی
یا وہ اُنکے آئینہ سے میری حیرت لائیگی
عید کیا میرے لئے پیغام عشرت لائیگی!

ہاتف غیبی

جہان آباد کی یہ سرزمیں معلوم ہوتی ہے
زمیں یاں رشکِ خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے
کوئی غم آشنا شاعر یہاں کچھ گنگناتا ہے
صدا اُس کی بہت اندوہگیں معلوم ہوتی ہے

شاعر
ہاتف غیبی سے مخاطب ہو کر

تجھ کو دردِ عشق کی شاید دوا معلوم ہو
تجھ کو رازِ زندگی رازِ بقا معلوم ہو

ہاتف غیبی

چشم دل کھول ذرا وادیٔ ایران میں چل
عشق کی بزم میں چل حسن کے ایوان میں چل

میں نیشاپور جا پہونچا حواس و ہوش سب گم تھے
وہاں اک شخص دیکھا رخ پہ کاکل جسکے برہم تھے
زباں پر شعر اُس کی اسم اعظم بن کے آتا تھا
نفس اسکے نفسہائے مسیح ابن مریم سے تھے

صبو بر دوش تھا اور محوِ گلگشتِ چمن تھا وہ
زمانے کی فضائے پُرسکوں پر خندہ زن تھا وہ
گرفتارِ محن تھا کوہ غم پر تیشہ زن تھا وہ
بہت مخمور تھا سرمست صہبائے سخن تھا وہ

ہاتف غیبی

دیکھ اے شاعر حزیں یہ ہے عمر یہ کمتر ہیں
کرے گا تجھ کو یہ دلنشیں حلاوتِ غم آتشیں

وہ پیر خضر صورت دیکھ کر مجھ کو لگا کہنے
ابھی غمہائے الفت تجھ کو آئے ہیں کہاں سہنے

شاعر خیام سے کہتا ہے
چہ خوش باشد غلام تو ضیائے بے نوا باشد
ز نورِ شعرِ جاں افروز در عالم ضیا باشد

خیام

آمد سحرے ندا ز میخانہ ما
کے رند خراباتی پیمانہ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

شاعر گنگنانے لگتا ہے

کیوں التزام ساغر و مینا کرے کوئی
اس چشم سحر کار کو دیکھا کرے کوئی
کیوں پھر نہ لے نگاہ میں خود جلوہ ہائے طور
کیوں آرزوئے شاہدِ رعنا کرے کوئی ؟
جب اس کا التفات ہی درماں ہو درد کا
کیوں آرزوئے درد نہ پیدا کرے کوئی ؟
مانا کہ وہ نقاب اُٹھائے ہوئے ہیں آج
کیوں اپنے ذوقِ دید کو رسوا کرے کوئی ؟

خیام

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است
نے بہرِ فساد و ترکِ دیں و ادب است
خواہم کہ بہ بے خودی برآرم نفسے
مے خوردن و شاد بودنم زیں سبب است

خم کے خم میں سے نے لنڈھائے صحبتِ خیام میں
بادۂ گلرنگ کا میں مدح خواں ہو ہی گیا

شاعر محو ہو جاتا ہے اور گانے لگتا ہے۔

ہے پرسشِ جراحتِ مژگاں کی آرزو
یعنی نوازشِ غمِ پنہاں کی آرزو
دل کو ہے پھر فریبِ تمنّا کا اشتیاق
شعر در بابِ زلفِ پریشاں کی آرزو
وحشت کو پھر طوافِ بیاباں کا شوق اُٹھا
پائے جنوں کو خارِ مغیلاں کی آرزو

عمر خیام کے اشارے سے ساقی شاعر سے کہتا ہے

شرابِ محبت کی مستی جُدا ہے
نہ یہ جام پی کر بہک جائیے گا
جو بعد از فنا آرزوئے بقا ہے
کسی کی محبت میں مر جائیے گا

قیدِ قفس

فکر کو رخصتِ پرواز نہیں
اور جوانی پہ ہزاروں ہیں حجاب
زندگی سینہ میں گھٹ گھٹ کے رہی جاتی ہے
بر لبِ شاہد و مینا کا وہ خواب
آج تک رو کشِ تعبیر نہیں
ساری محفل میں کسی کے دل میں
جذبۂ شوق کی تحریر نہیں۔

میں نے یوں عرض کیا حضرتِ یزداں کے حضور
مجھ کو معلوم ہے خلاقِ جہاں گلچیں نے

چاندنی پائمال کر ڈالی
سبزہ زاروں کو پھونک کر چھوڑا
کوہساروں کو پست کر ڈالا
تخت و تاراجِ گلستاں کا قصاص
خون گلچیں سے لیکے چھوڑوں گا
اور فرشتوں نے گر کیا انکار
بیعتِ اہرمن ہی کر لونگا۔

اِنصاف

تو نے انصاف کہیں دیکھا ہے؟
دیکھ قدرت کی یہ سفاک پروہی توبہ
انہی ایوانوں کے سایہ کے تلے
جن میں ہوتی ہے پرستش زر کی
مسکینی و غربت پلتی ہے
یزداں کی حکومت کیا معنی
شیطان کی حکمت چلتی ہے۔

میرا رومانِ زندگانی ہے
تین سو سال سے ظلمت میں اسیر
عیش کے ہلکے تصور تک سے
دل مرا کانپ کانپ اٹھتا ہے،
میرا آقا نہ دیکھ لے مجھ کو
ایک جامِ لالہ گوں پیتے ہوئے،
تو نے انصاف کہیں دیکھا ہے؟

تکمیل

اشکِ خونیں بھی بہت میں نے بہائے لیکن
زندگی میری فقط آہ گلوگیر نہیں
صرف اشکوں ہی کے افسانوں سے معمور نہیں
اس میں رومان بھی ہیں
اور رومانِ لطیف،

زندگی وہ بھی تھی آغوش میں کھینچا تھا تجھے
اور تری روح کو دیکھا تھا برہنہ میں نے
وہ گناہوں کی حلاوت کہ الٰہی توبہ
وہ ترے ساتھ طرب جنّت اہرمن میں۔

یاد ہے تجھ کو زمستاں کی وہ شب؟
لمس سے جس کا ہوا تھا آغاز
اس کا انجام بھی شاید تجھے بھولا تو نہ ہو
روح کو تیری کیا میں نے شناسائے نشاط
یاد ہے مجھ کو زمستاں کی وہ شب!

وہ مرا تجھ سے یہ کہنا کہ تو محبوبہ ہے
اور محبوبہ بھی اک عاشقِ بیباک کی ہے
جان اک مردِ جگر چاک کی ہے

تری تکمیل تو کرنے دے مجھے
تجھ کو محبوبہ بنانے دے مجھے
یاد ہے تجھ کو زمستان کی وہ شب؟

تیری تخلیق تو اللہ نے کی ہی تھی مگر
تیری تکمیل ہوئی دستِ جنوں سے میرے،
یاد ہے تجھ کو زمستاں کی وہ شب!

پابندیاں

چاندنی رات میں یوں زلف کو بکھرائے ہوئے
جس پہ سو بار خدائی ہو نثار
وہ جانِ آرزو کلی، وہ گلستاں کی اک کلی نکلی،
خاموش و سوگوار
محبت کے غم اٹھائے ہوئے۔
دل اس کا محبت کا اسیر
ہائے وہ اسکا شرابی سا بدن
ایک سرمایہ دار کی جاگیر،

اسکے خاموش لب مرے نالہ
یہ سب آرزو ئیں، یہ آنسو دعائیں
جنبش نہ دے سکیں گے خدائے بلند کو۔

شبستانِ محبت

اے مری شمعِ شبستانِ حیات
روح نے تیری کیا ہے انکار
میں کہ آفاق سے سرکش تھا کبھی
تیرے آگے سپر انداختہ ہوں۔

تو ہے اک آئینۂ نازک و شفاف و حسیں
جس میں میری چشمِ ظاہر بیں نے بھی۔
دیکھا آخر اپنا عکسِ بے حجاب،
اور اس کے ساتھ ساتھ، تو ہے اک مشاطہ بھی

میرے عکس سادہ و معصوم کو
تیرے دستِ لطف نے
کیا بنایا جاں نواز و دلپذیر و دل نواز۔

تیری قوت سے میں آگاہ نہ تھا
میں نے سمجھا تھا تجھے اک دخترِ حوائے حزیں
تو مگر تابندہ ہے مثلِ شعاعِ آفتاب،
زندگی کیا چیز ہے،
میرے فکر و نطق کی رعنائیاں، رنگینیاں،
تیرے الطاف و محبت کے نثار۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو
بے رُخی کی آخری گھاٹی تلک جائے گی کیا
راہ میں رہ جائے گی

اور میں ایک عشوہ کارِ محبوبہ کے ساتھ
جو جوانی میں مری
صبح کی تنویر بن کر آئی تھی
اک نئی جنّت بسانے جاؤں گا۔

تو نے میری جنّتِ موہوم کو
اپنے پیارے ناز سے مسمار کر ڈالا مگر
اک نئی جنّت بنا کر مجھ کو دی
روح کو جس نے دیا میری سکون و اضطراب
سوز و سازِ دلگداز۔

آج تک تجھ سے کبھی میں نے کہا تک بھی نہیں
اور کبھی آیا بھی گر لب تک خیال
دل مرا کانپا گیا لرزا گیا

کیونکہ میں ہوں ایک سرکش نوجواں
مجھ کو تیرے سامنے
آج کرنے دے
اپنے عجز و بے بسی کا اعتراف۔

میری فطرت کو بدل سکتا ہے کون؟
میں ہوں اب بھی ایک سرکش نوجوان،
سامنے تیرے مگر، مرا عزم سرکشی ماؤف ہے
تجھ سے میں سرکش نہیں
بلکہ ہوں تیرا غلام!
اے مری شمع شبستانِ حیات۔

شوریدہ سری

تمنّا نے دکھلائے رنگین خواب
ڈھونڈھ ڈالے کوہسار و آبشار و مرغزار
میری وحشت سے ہوئی وسعتِ صحرا غمناک
نہ شبستاں نہ خمستاں نہ محل ڈھونڈتا ہے
سرِ شوریدہ نئے دشت و جبل ڈھونڈتا ہے۔

شانِ ملّت

کہا جاتا نہیں گو کچھ زباں سے
نہیں اُٹھتی جبیں پر آستاں سے

زمانہ میں نہیں اب نام اپنا
مٹے جاتے ہیں ہم لوحِ جہاں سے

غضب اس پر یہ ہے افرادِ ملّت
نہیں ہیں آشنا سوز و فغاں سے

مگر کب تک سہے جائیں یہ آفات
کہ دل اب خون ہے اپنا زیاں سے

زمانہ کو دکھا دے شانِ ملّت
یہی ہے التجا پیرِ مغاں سے

نمودِ صبحِ صادق

کوئی نا عرش سے پیغام نیا آیا ہے   ہم نے اقبال سے کیا سیکھا ہی کیا پایا ہے

تاجِ زرّیں کو بھی نظروں سے گرانا سیکھا

فقر کو عشق کا ہم رنگ بنانا سیکھا

جبر کے پنجۂ خونیں کو گھمانا سیکھا

شاہبازوں سے ممولوں کو لڑانا سیکھا

مردِ حق تیغِ خودی لیکے جو ہشیار ہوا   ذہنِ آدم پہ سویرا ابھی نمودار ہوا

خود سر "ترقی پسند"

قصرِ اُردو میں ہے بپا کہرام
کیا کہوں چند "شاعرانِ کرام"
میر و مرزا کو دیتے ہیں دشنام
کیا "ترقی پسند" ہیں یہ لوگ!

شام سے شغلِ مے پرستی ہے
صبح تک عربدہ و مستی ہے،
بارِ غم اس طرح سے سہتے ہیں
رات زہرہ وشوں میں رہتے ہیں
کیا "ترقی پسند" ہیں یہ لوگ!

خونِ مزدور و نالۂ اقوام
زرگری کے یہ بت تراشے ہیں،
نام پر انقلاب ملّی کے
دام و درہم سے جیب بھرتے ہیں
کس قدر "خوش نصیب" ہیں یہ لوگ!

کیا ہوئی ہے ترقیٔ معکوس
قصرِ اردو میں ہے بپا کہرام
چند خود سر بزعمِ رنگِ جدید
میر و مرزا کو دیتے ہیں دشنام
کیا "ترقی پسند" ہیں یہ لوگ!

تسکین

زندگی نے کروٹیں بدلیں کئی
تجھ سے ملنے کا خیال
تیرے آنے کی اُمید
پھر بھی دُھندلی نہ ہوئی،
گیت تیرے مرے کانوں میں ابھی گونجتے ہیں،
روح آغوش کو پھیلائے تڑپتی ہے ابھی
نور سے کسب ضیا کرنے کو،

آبھی جا جلد کہ پھر نظروں سے نظریں مل جائیں
روح میری تری خوشبو سے معطر ہو جائے،
کچھ نہیں مانا یہ آسودگیٔ ذوقِ محبت ہی سہی
دل کو میرے ترے پاس آنیکی عادت ہی سہی۔

نظم سات سمتوں میں

ایک قطرۂ خون

دو سنہرے پنجے

اور حماقت کا پیلا پیلا گیت

ایک شفاف سے سینہ پہ ہوا کا وہ اُبھار

تین شبرنگ سے سرپٹ گھوڑے

پاؤں کچھ کرسیوں کے دیکھے
چٹ، چٹ ٹوٹے

اب ہر اک چیز بہت دور ہوئی جاتی ہے

ایک عورت کے شبستان میں چلنے کی صدا

اور اک خندۂ بے باک کی گونج

اب سماعت سے پرے ہو کے رہی جاتی ہے

[ترجمہ از شاعر اطالوی البرٹو جیاکومیٹی]

خواب

غزل آسا لے ہیں

خواب گاہ ختم ہوا اُن

آسمان کے خواب نغمہ

جاں بجا آرزو تنہا جی گئے

خواب آپ کا یہ تنہا تر

لٹرن کا تحفہ عمل سے

میں نے سوچا ہی نہیں، میں نے دیکھا ہی نہیں
لوگ جو دیکھ رہے تھے ہم کو،
اور بھی واں تھے بہت سے بستر
اور ہر بستر خواب آور پہ
ایک جواں، ایک پریرو محبوب
دونوں خاموش، اُداس۔

ذہن سُننے کو یہ تیار نہ تھا
تو نے یوں مجھ سے کہا، بے حجابانہ کہا
"ہاں مگر عشق ہوا تھا مجھ کو
مرا محبوب تھا اک مرد حسیں"
میرے احساس میں تھا حشر بپا
اور کہاں خون بدن میں میرے؟

میں نے تنہائی میں تجھ کو چھوڑا
اور بس ہال سے باہر نکلا،
تجھ کو کب تھی مری اُلفت درکار؟

گہن سا کیا لگ گیا اندیشہ کو؟
جانے کیا وسوسہ دل میں اُٹھا؟
کیوں مجھے ایسے خیال آتے ہیں؟
خواب، کیا خواب تھا بیکار! الٰہی توبہ!

[ماخوذ از شاعر انگلیسی ڈبلو، ایچ آڈن]

موت

موت یخ بستہ ہے، بیدار ہے گھر کے باہر
لاؤ میں کھول دوں دروازہ بُلا لوں اندر
ہاں ابھی روح کی پرواز ہے سینہ میں مرے۔

آج انوارِ سحر دیکھنے باہر جو گیا
سرو نے ہاتھ بڑھائے کہ لپٹ جاؤں میں
گھاس بچھاؤں اور اس روح کو چھوڑوں آخر،
وہ سرِ راہ جو کیچڑ سی نظر آتی تھی
کس طرح تاک رہی تھی مجھ کو؟
چاہتی تھی کہ مرا مشتِ غُبار
اس کی آغوش میں آسودہ ہو۔

اور امسال مرے ہل نے جو کھودی ہے زمیں
چاہتی ہے کہ مجھے بیج بنا کر بولے۔
ہاں ابھی روح کی پرواز ہے سینہ میں مرے!

لاؤ میں کھولدوں دروازہ بُلالوں اندر
موت کا آج کروں استقبال
ہاں ابھی روح کی پرواز ہے سینہ میں مرے!

(شاعر یونانی پورے وے لاکس سے متاثر ہوکر)

ہیرو

اس جنگ کے غیور جوانانِ سرفروش
کس نے دیکھا ہے انھیں ؟
ہاں مگر ان کا پتہ چلتا ہے
سوختہ شہروں کے پیراہن سے،
جن سے اُٹھتا ہے دُھواں
پھر آسمانوں کی طرف جا کے پگھل جاتا ہے۔

کس کو انسان کے ناخن کا پتہ چلتا ہے؟
ہاں وہی عقدہ کشا ناخنِ عقل
اور افریقہ کے صحرائے عظیم،
کونسی آنکھ سے ڈھونڈوں اے دُوست
ان جوانوں کے تخیل کا سُراغ،
جس کی چھاؤں میں پلے
رات ہو جن سے فروزاں وہ خواب۔

آہ وہ تیرا پرستار وہ تیرا عاشق
وہ تجھے بھول گیا، بھول گیا
وہ محبت سے سلگتی ہوئی تنگ آغوشی
آہ اب تجھ کو نہیں ملنے کی۔

ہائے سورج کی شعاعوں کے تلے
گھاس مشرق کی ہواؤں سے مڑی جاتی ہے
اور اک گوہر یکدانہ پڑا سڑتا ہے۔

(عکسِ نظمِ شاعرۂ انگلیسی کیتھلین رین
موصولہ ہندوستان فروری ۴۵ء)

بَم

یہ جنگ بھی عجیب ہے منحوس جنگ یہ

اک ہوا باز گھنے ابر کے ٹکڑوں کے پرے
خوب واقف ہے کہ وہ کس لئے بَم پھینکتا ہے
اپنی تہذیب کے جھنڈے کو کھڑا کرنے کو،
دیکھ کیا سکتا ہے وہ اپنے اُفق کے آگے
وہ اُفق جو نہیں غیر پردہ آواز،

اس کو انسان کہاں دیکھتے ہیں
غیر کے ملک کے درماندہ نفوس
اس کو معلوم ہے بس یہ کہ یہاں قصبہ میں
نیلگوں پانی کے دریا کے پرے،
لوگ کچھ رینگتے ہیں
اپنی تہذیب کے جھنڈے کو وہ کرتے ہیں سلام۔

بم گرا، خون بہا، ہو گئے زخمی کتنے
رینگتے چیونٹے ہنسیں یا روئیں،
کون کرتا ہے بھلا ان کا خیال
کون کرتا ہے انھیں آدمی زادوں میں شمار

ہوس

اربابِ خرد کا بول بالا نہ ہوا
صد حیف دماغوں میں اُجالا نہ ہوا
تن ڈھانپ لیا تو یہ فکر ہوئی دامنگیر
کاندھے پہ مرے آہ دوشالا نہ ہوا

قومیت

سنہ ۱۴-۱۸ء اک خون کے بدلے میں قوموں میں کھلی ہولی
اے وائے یہ چنگیزی، اے وائے یہ تیموری!
کہتے تھے یہ پیغمبر اب جنگ نہیں ہوگی

سنہ ۳۹-۴۵ء پھر جنگ چھڑی آخر پھر کھیلی گئی ہولی
کیا فطرتِ انساں ہے چنگیزی و تیموری؟
قوموں کی یہ "قومیت" گر ختم نہیں ہوگی
کیوں کہیے کہ آیندہ پھر جنگ نہیں ہوگی

(۲۵ اپریل سنہ ۴۵ء کو سین فرانسسکو کانفرنس
کے دوران میں لکھی گئی)

برف باری

برف گرتی ہے یونہی برف گرے جاتی ہے،
موٹر رستے کے نہیں دیکھتے اَب
دھند بڑھتی ہی چلی جاتی ہے،
دیوداروں کے درختوں پہ دُھواں چھایا ہے۔

چمپئی رنگ پہ وہ شربتی ساری اسکی
وہ رس بھری آنکھیں اُسکی
اور وہ ہاتھ وہ ہونٹ
مجھ سے اب دُور ہوئے جاتے ہیں،
اور احساس کے گالے ہر سو
خون بن بن کے اُڑے جاتے ہیں،
اور تنہائی کا گھُٹتا ہے دھواں
انجمن سرد ہوئی جاتی ہے،
برف گرتی ہے یونہی برف گرے جاتی ہے۔

اب سیہ بختیِ انساں کا گلہ کیا کیجے
ہائے اب حسرت و حرماں کا گلہ کیا کیجے،
زندگی برف کے مانند گھلی جاتی ہے
سرد ہو جاتا ہے احساسِ حیات،
برف گرتی ہے یونہی برف گرے جاتی ہے۔

آدمی رنج کو برداشت کیے جاتا ہے
دیوتاؤں کو مگر نیند کہاں آتی ہے،
فکرِ انسان کو مدہوش بنا کر اب تک
درد اور کرب کے طوفان اُٹھا رکھے ہیں،
دلِ آدم کو تمنّا کی تپش دکھلائی
ہائے وہ درد نہیں جس کا مداوا کوئی،
برف گرتی ہے، یونہی برف گرے جاتی ہے۔

پردۂ انکار

مردانِ خوش افکار کو زیبا نہیں گفتار
بس صاحبِ کردار ہو بس صاحبِ کردار
اِک قوم کی عظمت ہے پسِ پردۂ انکار
مردانِ گراں خواب ہوں اب خواب سے بیدار
خونِ رگِ دشمن میں شرارت کے ہیں شعلہ
چلتی ہوئی تلوار پہ سب کھلتے ہیں اسرار
مردانِ حق آگاہ کو لازم ہے سیادت
رنگینیٔ افکار سے بیزار ہو بیزار

مژدہ ہو کہ جمہور کا آتا ہے زمانہ
سب لوگ مئے حُبِّ وطن سے ہوئے سرشار
بے معرکہ قوموں کے کہیں کھلتے ہیں جوہر
بس حرّیتِ قوم ہے اِک نعرۂ دیندار

حلاوتیں

اُس کمر کی نزاکتیں مت پوچھ
اُس دہن کی لطافتیں مت پوچھ
شوق نے اُن سے کیا کہیں باتیں
کیسی پائیں حلاوتیں مت پوچھ

خم و پیچ

مری نگاہ کے وہ شکوہ ہائے گوناگوں

تمھاری آنکھوں میں کل کی سی آہ بات نہیں
وہ رنگِ التفات نہیں
وہ شوق و انبساط نہیں
مگر کسی سے تمھیں چاہ بڑھ رہی ہے کہو!

مرے خیال کی رعنائیوں میں تم ہو ابھی
تمھارے گیسو کی خوشبو ہے مایۂ خوبی
تمھاری آنکھوں سے امرت ابھی ٹپکتا ہے
تمھارے سامنے ہے چاندنی بھی پھیکی سی
یہ کیا ہوا کہ تنفس میں گرمیاں نہ رہیں
مگر کسی سے تمھیں چاہ بڑھ رہی ہے کہو!

یہ زندگی کی حلاوت کہ عقل اب ہے مصر
کہ زندگی ہی میں ہوں زندگانیاں پیدا
کسی کے ساعدِ نازک کی مدح کر دیجے
کسی کے کاکلِ پیچاں میں آج لیجے پناہ
رُخِ زیبا کی چھاؤں میں رہ کر
بادۂ چشم احمریں پیجے

اور پھر اک نگارِ تازہ کے
رُخ وِ کاکُل کی مدح کر دیجے
دوسری زندگی کا ہو آغاز
حُسن ہر پیکرِ حسین میں ہے
حُسن میں انتخاب کیوں کیجے۔

دل مگر کہہ رہا ہے اب بھی یہی
صرف تیری ہی پرستش کیجے

مجاہدانِ ہسپانیہ
کا
عزمِ شبخون

آج تک شب ایسی آئی ہی نہ تھی

یہ جوانی اور یہ رعنائی نہ تھی
ایسے پیمانے نہ چھلکے تھے کبھی
یہ ہوائے بزم آرائی نہ تھی
آج تک شب ایسی آئی ہی نہ تھی

اس طرح آباد میخانہ نہ تھا
اس طرح نغمے نہ گونجے تھے کبھی
ایسے آویزے نہ چمکے تھے کبھی
یوں لبِ لعلیں نہ دہکے تھے کبھی

آج تک شب ایسی آئی ہی نہ تھی

ہاں ستارے یوں نہ دمکے تھے کبھی
اس طرح جگنو نہ چمکے تھے کبھی
ایسی تاریکی کبھی چھائی نہ تھی
آج تک شب ایسی آئی ہی نہ تھی

ہیں جوانانِ وطن رنگیں مزاج
انکو شبخوں پر مگر جانا ہے آج
نغمۂ ملّی انھیں گانا ہے آج
آج تلواریں ہوئی ہیں بے نیام
خوں سے غداروں کے ہونگی شاد کام
آج تک شب ایسی آئی نہ تھی

حیاتِ زبوں

آج کیوں سرد ہوئی جاتی ہے محفل دل کی
آج کیوں بربطِ شوریدہ میں آواز نہیں
آج کیوں شمع فروزاں سے دھواں اٹھتا ہے
آج کوئی مرا ہمدم، مرا دمساز نہیں

ہاں مگر محفلِ عالم کا یہی رنگ ہے آج
نابلد ہو گئے رسم و رہِ الفت سے عوام
ورنہ قرآن کے سیپاروں کو یکجا کر کے
یکجہت ہو کے بناتے نئی وحدت کا نظام
اک نئے دور کا کر دیتے اسی سے آغاز

آج پیراہنِ صد تار فروزاں ہے ندیم
آج ملّت کا مگر حال زبوں ہوتا ہے
دل ہر اک صاحبِ ادراک کا خوں ہوتا ہے
اور مرا خواب پریشان ہوا جاتا ہے
میرا گہوارۂ ملّت کا خوش آیند سا خواب

زندگی کیا یوں ہی تلخابی میں گذرے گی ندیم
کیا یوں ہی میرے نشیمن میں رہیں گے اغیار
کیا کبھی میری خودی رنگ نہ لائے گی ندیم
کیا یہ خاکسترِ انسان نہ سلگے گی کبھی
کیا مرے باغِ تمنّا میں نہ پھوٹے گی کلی

۱۶ر مئی ۱۹۴۹ء

شکست

یہ کیا ہوا کہ محبت میں شوخیاں نہ رہیں
متاعِ شوق کو اک رازداں نے لوٹ لیا
امیرِ قوم نے کیا جانے ساحری کیا کی
کہ رختِ راہ کو خود کارواں نے لوٹ لیا
عروجِ حرمتِ ملّی کا جن کو سودا تھا
خدا گواہ اُنھیں رازداں نے لوٹ لیا
دکھائے خواب کہ بس روح جگمگا اُٹھی
جب آیا وقت تو خوفِ زیاں نے لوٹ لیا

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ جام و پیمانہ
کہ میرے خواب کو خود کارواں نے لوٹ لیا

کوئی یہ لوٹ تو دیکھے پہنچ کے منزل پہ
یقین و شوق مرے رازداں نے لوٹ لیا

اس انجمن کو نہیں ساز سازِ حریّت
متاعِ فقر کو سود و زیاں نے لوٹ لیا

۳؍ جون ۱۹۴۶ء
مطبوعہ سلیمی برقی پریس الہ آباد